اسلامی معاشرے کی تشکیل جدید میں انسانی اقدار کا کردار فکر اقبال کی روشنی میں

رضیہ شبانہ*

Abstract

Allama Muhammad Iqbal is a modern thinker, philosopher and poet. In his poetry, he emphasizes moral values of contemporary philosophy and ethics. He narrates dignity of human being as well as the other moral and spiritual aspects of life. He explores the values of modern era and points out the need of equality, dignity, action and self-esteem as ethical values of human kind. In this article we analysis moral aspects of Iqbal thought in the light of Islamic thought.

Keywords: Ethics, Basic Concept of life, Concept of Khudi

تعارف:

علامہ محمد اقبال برصغیر کے وہ عظیم شاعر، فلسفی اور مذہبی سکالر ہیں، جنھوں نے اپنی فکر میں زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمو دیا ہے۔ ان کی فکر میں جہاں تعمیر انسانیت، فکر عمل اور طرز حیات کی بات ہوتی ہے وہیں اس فکر کی بنیادیں اسلامی اساسی ماخذ سے بھی پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ اسلام کی اساسی تعلیمات ہی ان کی فکری سوچ کی عکاس معلوم ہوتی ہے جو ان کے افکار و محور کی بنیادیں بھی سمجھی جاتی ہے۔ جہاں تک انسانی عادات، طور اطوار اور اقدار کا تعلق ہے تو فکر اقبال میں بھی اس تصور کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے تاکہ انسان اپنی تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی میں ان اقدار سے مزین ہو کر اپنی زندگی گزار سکے۔ اقبال نے انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے فلسفہ خودی کا تصور دیا ہے۔ فلسفہ خودی میں انھوں نے چار بنیادی عناصر (اخلاقی اقدار، عشق، جرات اور حریت) کا پیغام دیا ہے۔ تعمیر خودی، تعمیر اخلاق اور تعمیر کردار کا ہی نام ہے اسی لیے علامہ محمد اقبالؒ نے تربیت خودی پر بہت زور دیا ہے کیونکہ اسی سے انسانی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور اسی سے شخصیت میں استحکام پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسانی زندگی کامل نمونہ بنتی ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے استحکام خودی، اثبات خودی اور نفاذ خودی کو اسلامی تعلیمات اور مغربی اخلاقی روایات کے حوالے سے بھی جدید انداز میں پیش کیا ہے۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک اخلاق کے لیے شرط یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزاری جائے، اس لیے آپ اخلاق محمدی ﷺ پر زور دیتے ہیں کیونکہ اخلاق سے قوموں کے اجتماعی کردار میں حسن و جمال کی کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک علامہ محمد اقبالؒ کے فکری تصورات کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنی فکر میں معاشرت، معیشت اور سیاست سے متعلق ہر پہلو پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ معاشرت کو آپ نے اپنی تصانیف، خطبات و مقالات اور شاعری میں بیان کیا، عروج و زوال اور طرز تمدن کی حقیقت و حیثیت کو بڑے خوبصورت انداز میں واضح کیا اور اصلاح معاشرہ کے لیے بھی جو وہ تڑپ رکھتے تھے اس کا اظہار بھی انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا کر دیا ہے۔ انسانی طرز معاشرت میں آج جس چیز کی سب سے اہم ضرورت ہے وہ اخلاقی اقدار و تصورات ہیں جس کی طرف بھی علامہ محمد اقبالؒ نے اپنی فکر میں جابجا اظہار کیا ہے اور مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ کو بیان کیا ہے۔ ہم آنے والے صفحات میں اسلامی معاشرے کی تشکیل جدید میں انسانی اقدار کا کردار کا فکر اقبال کی روشنی میں تفصیلی جائزہ بھی پیش کریں گے۔

انسانی اقدار، مفہوم و اہمیت:

تہذیب انسانی کا مطالعہ کیا جائے تو زندگی سے بھرپور فائدہ اٹھانا، خاطر خواہ لطف اندوز ہونا اور کامیاب زندگی گزارنا یقیناً سب کا حق ہے۔ لیکن انسانی زندگی کو گزارنا صرف اسی وقت تک ممکن ہے جب زندگی گزارنے کے سلیقے و طریقے جانتے ہوں، کامیاب زندگی کے اصول و آداب سے واقف ہوں۔ ان اصول و آداب سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ عملی طور پر زندگی کو آراستہ اور شائستہ بنانے کی کوشش میں سرگرم عمل بھی ہوں۔ ادب و سلیقہ، وقار و شائستگی، نظامت و پاکیزگی، تمیز و حسن انتخاب، عالی ظرفی، شریں کلامی تواضع اور انکساری، ایثار و قربانی وغیرہ یہ اسلامی زندگی کے وہ دلکش خدوخال ہیں جن کی بدولت انسانی زندگی میں وہ غیر معمولی کشش پیدا ہو جاتی ہے جس سے نہ صرف اہل اسلام بلکہ اسلام سے ناآشنا لوگ بھی بے اختیار اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ عام ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو تہذیب زندگی کو نکھارنے، سنوارنے اور غیر معمولی جاذبیت سے آراستہ کرنے کے لیے انسانیت کو یہ بیش بہا اصول و آداب عطا کرتی ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ پوری انسانیت اس کو قبول کر کے اس کی بنیادوں پر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کامیاب تعمیر کرے تاکہ دنیا کی زندگی بھی راحت و سکون،

عیش و نشاط اور امن و عافیت کا گہوارہ بن جائے۔ معاشرے میں ایسے اخلاق و اقدار کا ظہور ہو جو انسانی زندگی کو مہذب اور شائستہ بنادے اور انسان فطری اصول وآداب کے مطابق زندگی گزار سکے۔

انسانی اقدار کا مطلب یہ ہے کہ انسان جن خوبیوں کے مطابق زندگی گزارتا اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کو جو اہمیت دیتا ہے اسی لیے ان اوصاف اور اقدار کو انسان کی تہذیبی زندگی میں نمایاں مقام دیا جاتا ہے۔ گویا اقدار سے مراد وہ بنیادی اوصاف ہیں جن سے کسی شے یا کسی عمل کی اہمیت کو واضح کرنا ہے تاکہ اس سے اس کا مقصد متعین کیا جاسکے۔ انسانی زندگی میں اخلاقیات اور انسانی اقدار کی بہت اہمیت ہے کیونکہ انھی اقدار سے انسانی زندگی میں تہذیبی شعور پیدا ہوتا ہے۔ اقدار در اصل انسان کے فعل، طرز عمل اور کام کے وصف کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے انسانی زندگی میں حسن خوبی اور اچھی زندگی کا تصور ملتا ہے۔ اقدار اپنے آپ میں کسی شخص کی اچھائی یا برائی سمجھنے کی حس کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ انسانی اقدار انسانی رویوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور انھیں اقدار کی وجہ سے بھی لوگوں کا حسن و قبح سامنے آتا ہے۔ انھی اوصاف اور اقدار کی وجہ سے لوگوں کے طرز رہن سہن کی پہچان ملتی ہے اور ان کی عادات واطوار، گفتار اور سلیقہ شعاری بھی اسی سے عیاں ہوتی ہے۔

اقدار (اخلاقیات) انسانی زندگی کا بنیادی وصف ہیں، انھی اوصاف سے انسانی زندگی کی پہچان ہوتی ہے، انھی اوصاف سے انسان کے کردار میں پختگی آتی ہے، انھی اوصاف کی بنیاد پر انسان کی عملی زندگی میں اچھائی جنم لیتی ہے اور انسان معاشرے کے لیے مفید شہری بنتا ہے اور یہی انسانی اقدار اس کے حقوق و فرائض کی محافظ ہوتی ہیں۔ ہر معاشرے میں ان اقدار کا اپنا ایک تشخص ہوتا ہے، جو اس قوم کی پہچان بھی بنتا ہے اور پھر یہی قومی تشخص دوسری اقوام پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ انھی اوصاف اور اقدار کی وجہ سے قوموں کی زندگی سے تہذیبی عکس بھی واضح ہوتا ہے۔ انسانی اقدار میں اخلاقی قدر سب سے اہم تسلیم کی جاتی ہے کیونکہ اخلاقی اقدار و روایات کا انسانی زندگی پر ایک نمایاں اثر ہوتا ہے۔ اسی لیے اخلاقی روایات کی اہمیت ہر معاشرے میں تسلیم کی جاتی ہے۔

اخلاق وہ اساسی علم ہے جس سے شخصیت انسانی کی نشو نما ہوتی ہے، انسانی طرز زندگی بھی اسی سے منعکس ہوتی ہے اور اس کی سنہری کرنیں انسان کی معاشرتی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ گویا یہ وہ علم ہے جو انسان کے کردار و افعال، طرز حیات اور شخصیت سازی میں نکھار پیدا کرتا ہے اور اسی سے معاشرتی زندگی کی تعمیر و ترقی ہوتی ہے۔ اخلاق ایک جامع تصور کا نام ہے جو پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ اسی لیے بہتر زندگی گزارنے کے لیے اخلاقی اقدار کے فروغ کا تصور ملتا ہے۔ انسانی تہذیب کی بنیادیں بھی اخلاقی اقدار پر قائم رہ سکتی ہیں، اس لیے اخلاقی اقدار

کو معاشرتی زندگی کی اصلاح کا بھی بنیادی ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور انسانی تہذیبوں میں اسلامی تہذیب وہ عملی طریقہ ہے جس سے شخصیت کی نشو نما ہوتی ہے۔

ڈاکٹر زاہد منیر عامر اپنی کتاب آئینہ کردار میں لکھتے ہیں۔

"انسانی فطرت کا سرچشمہ شفاف ہے اور انسان اپنی سرنوشت اپنے قلم سے لکھ سکتا ہے جب فطری قویٰ اپنی حدود میں رہ کر بدون لغزش عمل پیرا رہتے ہیں تو اخلاق حسنہ کہلاتے ہیں اور جب یہی فطری قویٰ دائرہ توازن سے نکل کر افعال انجام دینے لگیں تو اخلاق سیئہ بن جاتے ہیں۔ اگر نفس مسلسل فطری تقاضوں کی تکمیل دائرہ توازن سے نکل کر کرتا رہے تو پھر انسانی فطرت کا وہ سرچشمہ جسے قسام ازل نے صاف وشفاف رکھا ہے گدلا بھی ہو جاتا ہے۔ اصولی طور پر کوئی جذبہ برا نہیں اور نہ ہی کسی جذبے کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اسے کچل دیا جائے۔ طبعی جذبات خاص مقاصد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور یہی جذبات خاص ترتیب سے حسن اخلاق بن جاتے ہیں۔"[1]

معلوم ہوا کہ انسانی سیرت و کردار میں اخلاق اور اخلاقی اقدار کا بہت عمل دخل ہوتا ہے انھی اقدار کی وجہ سے انسانی شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے اور بہترین کردار سازی سے اچھے عمل کی بھی پہچان کی جاتی ہے۔ انسانی اعمال و افکارار اور طرز زندگی میں حسن بیان کی اہمیت بھی اسی اخلاق اور اخلاقی اقدار کی وجہ سے ہی تسلیم کی جاتی ہے۔

انسانی اقدار: اقسام وارتقاء:

جب انسان پیدا ہو کر اس دنیا میں تشریف لاتا ہے تو تمام رذائل سے پاک ہوتا ہے اور اس کا دل تمام خوبیوں، حقائق و معارف سے مزین ہوتا ہے۔ پھر وہ جیسے جیسے اس دنیا کے مزاج سے آشنا ہوتا ہے تو دنیاوی اسباب و عوامل اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، جن کی بعد میں تطہیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جان ایس ہائی لینڈ اپنی کتاب "مختصر تاریخ تمدن" میں انسانی طرز حیات کے بارے میں لکھتا ہے:

"انسان نے اپنے ماقبل مورثوں سے بہت سی جبلتیں[2] ورثے میں پائی ہیں اور یہ جبلتیں اب تک افراد اور جماعتوں کی زندگی اور سرگرمی میں پوشیدہ ہیں۔ اگرچہ انھیں ان کے اثر کا شعور نہیں مگر ایسی جبلتیں انسان کو مجبور

---

[1] ڈاکٹر زاہد منیر عامر، **آئینہ کردار**، (لاہور: شیخ زید اسلامک سنٹر، جامع پنجاب، طبع دوم ۲۰۱۳ء)، ۲۰

[2] جبلتیں ایسے فطری یا موروثی میلانات ہیں جو تمام فکر و عمل کے مبتدا اور محرک ہوتی ہیں، خواہ یہ انفرادی ہوں یا اجتماعی ہوں۔ یہ ایسی بنیادیں ہیں جن پر افراد اور قوم کا کردار تدریجی طور پر تعمیر ہوتا ہے۔ (کمنڈ انلڈ، سماجی نفسیات، ۱۹)

کرتی ہیں کہ وہ موت سے بچے اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی سعی کرے۔ یہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ کہ وہ بچوں کی پرورش کے ذریعے نسل کو برقرار رکھے اور وہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ کہ وہ ہر اس چیز کی مدافعت کرے جو اس کی یا اس کے بچوں اور دوستوں کی سلامتی کو خطرے میں ڈالے۔ یہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ باہم مل کر خاندان، قبیلہ اور قوم کی صورت اختیار کرے تاکہ بہتر سے بہتر طریقے پر تحفظ ذات اور آسودگی حاصل کرے۔"[3]

جہاں تک انسان کی شخصیت اور کردار سازی کا تعلق ہے تو فطری اصولوں کے مطابق اس کی طرف بھر پور توجہ دی جاتی ہے۔ انسانی اقدار سے اس کو راسخ بنایا جاتا ہے تاکہ وہ ایسی عادات و اطوار کو اپنائے جو اسے تکریم انسانیت اور تہذیبی شعور عطا کرے۔ مولانا حفظ الرحمن، سیوہاروی اپنی کتاب اخلاق اور فلسفہ اخلاق میں لکھتے ہیں انسان کی اعلیٰ شخصیت کا اندازہ اس کے طرز بود و باش، لطافت طبع، نرمی رفتار، شیرینی گفتار، طریق اکل و شرب، اصول صحت پر اقدام اور تہذیب و تربیت کی جانب توجہ جیسے امور سے ہی کیا جا سکتا ہے اور زندگی میں اس کی شخصیت کی تقویم اور اس کے کامرانی کے درجات کی تعیین ان ہی عادات کی وجہ سے آشکارا ہو سکتی ہے۔[4]

انسان کی جب سے تہذیبی زندگی کا آغاز ہوا ہے تب سے انسان شعوری طور پر اسے سلیقہ شعاری سے سنوارنے کی سعی میں رہتا ہے۔ مگر تغیر وقت کے ساتھ ساتھ دوسری اقوام اور ان کے تہذیبی اثرات اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں جن کی درستگی و اصلاح کے لیے انسان قانونی و اخلاقی اقدار کو اختیار کرتا رہا ہے۔ ول ڈیورانٹ اپنی کتاب "انسانی تہذیب کا ارتقاء" میں زندگی کی حقیقت، تہذیب کے مقاصد اور اخلاقی اقدار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"لالچ کو کفایت شعاری، تشدد کو استدلال، قتل کو قانونی چارہ جوئی اور خودکشی کو فلسفے میں تبدیل کرنا تہذیب کے مقاصد کا حصہ رہا ہے۔ جب طاقت ور نے کمزور کو قانونی طریقے سے کھانا شروع کیا تو ایک لحاظ سے یہ بہت بڑی ترقی تھی۔ کوئی بھی معاشرہ اس صورت میں قائم نہیں رہ سکتا اگر وہ اپنے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اسی سلوک کی اجازت دے جو وہ دوسرے گروہوں کے ساتھ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ خارجی مقابلے کے لیے داخلی تعاون پہلا قانون ہے، جہد بقاء امداد باہمی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ گروہ کو منتقل کی جاتی ہے۔ دوسرے حالات کے ساتھ ساتھ دشمن گروہوں سے مقابلہ کرنے کی اہلیت متحد ہونے کی انفرادی اور خاندانی اہلیت کے

---

[3] جان ایس ہائی لینڈ، **مختصر تاریخ تمدن**، مترجم سید مبارز الدین رفعت، (دہلی: انجمن ترقی اردو، طبع اول ۱۹۴۴ء)، ۲۷

[4] مولانا حفظ الرحمن، سیوہاروی، **اخلاق اور فلسفہ اخلاق**، (دہلی: فاروقی پریس، طبع دوم ۱۹۵۰ء)، ۶۳

متناسب ہو گی۔ چنانچہ ہر معاشرہ ایک اخلاقی ضابطہ[5] سکھاتا ہے اور فرد کے اندر معاشرتی مزاج پیدا کرتا ہے جو زندگی کی فطری جنگ کو دباتا ہے۔ ان خوبیوں یا عادات کو جو معاشرے کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں اچھائیاں کہہ کر فرد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جبکہ ان کے برعکس عادات کو برائیاں کہہ کر ان کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اس طرح فرد خارجی اعتبار سے معاشرتی انسان اور جانور شہری بن جاتا ہے۔"[6]

انسانی کی شخصیت سازی میں اخلاقی اقدار کا بہت زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔ ان اقدار و روایات کا انسانی طرز عمل میں بھی واضح طور پر عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر امام غزالی کے فلسفہ مذہب و اخلاق کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے افکار میں انسانی شخصیت اور اس کے اعمال و افعال میں اخلاق اور اخلاقی اقدار کا عنصر بھی واضح نظر آتا ہے۔

"ہر انسان کی طبیعت میں اخلاقی مادہ موجود ہوتا ہے اور اسی بنا پر انسان سے اعمال کا ظہور ہوتا ہے لیکن صرف طبیعت میں محرکات اَخلاق(Ethical Motives)موجود ہونے سے انسان خوش اخلاق نہیں ہو جاتا۔ جب تک وہ اخلاق کے اصول نہ ہوتے اور وہ غلطیاں جو کسی طاقت کے اندھا دھند استعمال سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان سے دور نہ رہے۔ لہٰذا علم الاخلاق ایسا ضابطہ قانون ہے جس پر عمل کرنے سے ایک شخص انسان کامل (Perfect Man) بن جاتا ہے۔ جس قدر جو شخص ضابطہ اخلاق کا زیادہ پابند ہو گا اسی قدر وہ باکمال ہو گا۔ درست ونادرست افعال میں اعتبار، افعال و کردار کی رہبری کے لئے معین اصول و قوانین، ان قواعد وضوابط میں دقت نظر کے ساتھ غور وخوض اور اس قسم کے سوچ وبچار کے مجموعہ کا نام علم الاخلاق ہے۔"[7]

یہی وجہ ہے کہ جب سے انسان کی تہذیبی زندگی کا آغاز ہوا تب سے انسان بہتر زندگی گزارنے اور شخصیت و کردار سازی میں وقت کے ساتھ ساتھ خود کی تطہیر کرتا رہا ہے اور انسان کی یہ تطہیر ان اوصاف و اقدار اور

---

[5] "اخلاقی ضابطے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ نامتبدل یا بتدریج تغیر پذیر انسانی فطرت کے ہیجانات کو معاشرتی زندگی کی متغیر ضرورتوں اور حالات کے مطابق بنائے۔ لالچ اکتسابیت، بے ایمانی، ظلم اور تشدد جانوروں اور انسانوں کی بہت ساری نسلوں میں بہت مفید تھا جسے ہمارے تمام قوانین، تعلیم، اخلاقیات اور مذاہب ختم نہ کر سکے۔ ان میں سے بعض آج بھی موجود ہیں۔ جانور خوب ٹھونس کر کھاتا ہے کہ کیونکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے دوبارہ کھانا کب ملے گا۔ یہ بے یقینی لالچ کی بنیاد ہے۔" ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقاء، ۸۲

[6] ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقاء، مترجم تنویر جہاں، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء)، ۸۵

[7] قادری، سید حسین، ڈاکٹر، **امام غزالی کا فلسفہ مذہب واخلاق**، (دہلی: ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد)، ۳۳۴

کمالات کے بغیر ممکن ہی نہیں جو فطرت نے اس کے لیے بنائے ہیں۔ اگر انسان کی تہذیبی زندگی مین ان اقدار کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل قسمیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ معاشرتی اقدار ۲۔ سماجی اقدار ۳۔ معاشی اقدار ۴۔ سیاسی اقدار ۵۔ ثقافتی اقدار

۶۔ مذہبی اقدار ۷۔ روحانی اقدار ۸۔ اخلاقی اقدار

ان اقدار و روایات کا انسانی زندگی میں بہت مقام ہے کیونکہ انھی اقدار سے انسانی شخصیت اور طرز فکر و عمل کی پہچان بھی ہوتی ہے۔

مولانا حفظ الرحمن، سیوہاروی اپنی کتاب اخلاق اور فلسفہ اخلاق میں لکھتے ہیں:

"اگر ہم فطرت انسانی کا مطالعہ کریں تو شاذ و نادر سے قطع نظر تمام انسان اہم اختلافات باہمی کے باوجود یکساں طور پر شرافت، حق گوئی اور صداقت جیسے فضائل کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان فضائل کے میلانات و رجحانات میں قوت و ضعف کے اعتبار سے ان کے درمیان تفاوت ہی کیوں نہ پایا جاتا ہو۔ پس اگر اس کو صحیح تربیت حاصل ہے تو وہ انسان کے اس پاک میلان میں قوت پیدا کر دیتی ہے اور اس کی صلاحیت طبع کے مطابق اپنی دسترس کی حد تک اس کا اخلاق (اقدار) کاملہ کے عروج پر پہنچا دیتی ہے اور اگر بری تربیت سے واسطہ ہے تو وہ اس کے اس رجحان کو کمزور اور ضعیف کرتی ہے اور فنا کے گھاٹ اتار دینے کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔"[8]

انسان جب تک غیر متمدن ہوتا ہے اس وقت تک اس پر طبعی (مادی) ماحول[9] کا اثر غالب رہتا ہے اور جب اس کو تمدن کی ہوا لگتی ہے اور وہ اس سے بہرہ وہ ہوتا ہے تب اس میں اجتماعی (روحانی) ماحول کا اثر سرایت کرنے لگتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ اس پر اپنا زبردست تسلط جما لیتا ہے اور اس میں یہ قدرت ہو جاتی ہے کہ ماحول کی اصلاح حال کے لیے کسی قسم کا تغیر کر سکے یا اس پر تسلط جما سکے نیز اس سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے نفس کو معتدل حالت پر لا سکے۔[10]

"نفس انسانی اپنے کردار میں تین امور میں سے کسی ایک امر سے متعلق ہوتا ہے۔ ایک طبیعت، دوسرا حال اور تیسرا ملکہ ہوتا ہے۔ طبیعت جبلت کا نام ہے جس میں تغیر و تبدل کا قطعی امکان نہیں، حال نفس کی اس

---

[8] مولانا حفظ الرحمن، سیوہاروی، **اخلاق اور فلسفہ اخلاق**، ۳۴

[9] ماحول ان اشیاء کو کہا جاتا ہے جو جاندار جسم کو گھیرے ہوئے ہوں اور جسم کی نشو نما کرتے ہوں۔

[10] مولانا حفظ الرحمن، سیوہاروی، **اخلاق اور فلسفہ اخلاق**، ۷۷،۷۶

کیفیت کا نام ہے جس سے استبداد قبول کی بنا پر نفس متکیف ہو تا مگر جلد ہی زوال بھی قبول کر لیتا ہے، جب کہ ملکہ [11] اس کیفیت یا قوت کا نام ہے جو نفس انسانی میں راسخ ہو جاتی ہے اور اس کا زوال ہو تو سکتا ہے لیکن بمشکل اور بتاخیر۔ اس کے بعد یہ واضح ہے کہ خلق ان تینوں کیفیات میں سے نفس کی اس کیفیت سے متعلق ہے جو ملکہ کہلاتی ہے اور اس کا حال مزاج سا نہیں ہے۔ لہٰذا علم الاخلاق کے ذریعے اس کی تہذیب واصلاح ممکن ہے۔"[12]

گویا علم الاخلاق سے مراد وہ انسانی اوصاف و کمالات اور کردار جس کے متعلق بحث کی جاتی ہے تاکہ ان اوصاف کی بنیاد پر انسانی شخصیت کی پہچان ہو سکے اور انھی اوصاف کی بنیاد پر انسانی شخصیت میں نکھار پیدا ہو جو انسانی شخصیت میں توازن کے معیار کو بھی برقرار رکھے۔ کسی بھی قوم کی ثقافت کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسی اقدار پر قائم ہو جس کا تعلق عقیدہ، فکر طرزِ زندگی اور زندگی کے مقصد کے تعین کے ساتھ ہو۔ اس طرح ثقافت روحانی، نفسیاتی اور معاشرتی اثاثہ قرار پاتی ہے۔ جو تاریخ کا ایک ایسا مرکز و محور ہوتی ہے جس سے کسی بھی قوم کی تاریخ کے مختلف پہلو اور گوشے جنم لے رہے ہوتے ہیں۔ تاہم اگر ثقافت مثبت معاشرتی اقدار کو جنم نہ دے یا وہ اپنی اساس کے لحاظ سے مستقل اور آفاقی اصولوں سے محروم ہو تو ایسی ثقافت کھوکھلی اور ادھوری ثقافت قرار پائے گی۔ جو کوئی بھی بڑی تہذیب تشکیل دینے میں ایک فعال کردار ادا نہیں کر سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ثقافت موثر تعبیر اور ترجمانی کرے جو اقدارِ معاشرہ کے مثبت اور اہم خدوخال کا تعین کرے جو معاشرے کی ترقی اور نسلوں کی حرکت کو منظم کرے ۔ کسی معاشرے کی ثقافت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس قدر موثر ہو کہ اقدار کا دائرہ کار متعین کرے اور انہیں مضبوط بنائے، کیونکہ کسی بھی معاشرے میں اقدار ہی وہ معیار ہے جو معاشرے کو مضبوط بناتی ہے اور اچھی روایات کو فروغ دیتی ہے۔ اسی طرح معاشرہ مستقبل کی ایسی مثالی تصویر پیش کرتا ہے جس کی بنیاد دیرپا اور آفاقی انسانی اقدار پر مبنی ہوتی ہے۔

---

[11] ملکہ کی تہذیب و تربیت مختلف حوال و کیفیات کے پیش نظر متفاوت طریق کار کی متقاضی ہے۔ پس اگر فکری یا عادی کیفیات و ملکات کسی ایسے عمل پر امادہ کرتے ہیں جس کا نتیجہ اور ثمر بہتر ہے تو ازبس ضروری ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی اور ایسے بواعث و محرکات کی نشو نما کی جائے اور اس طرح اس عمل کو بار بار دہرایا جائے اور اگر اس عمل کے ثمرات و نتائج بد ہیں تو واجب ہے کہ ان محرکات کی مدافعت کی جائے اور ان کا سد باب کیا جائے تاکہ وہ عمل دوبارہ عالم وجود میں نہ آسکے۔ مولانا حفظ الرحمن، سیوہاروی، **اخلاق اور فلسفہ اخلاق**، ص ۴۴

[12] مولانا حفظ الرحمن، سیوہاروی، **اخلاق اور فلسفہ اخلاق**، ۲۴

اقبال کے ہاں انسانی اقدار کا تصور:

علامہ محمد اقبال برصغیر کی وہ عظیم شخصیت ہے جنھوں نے اپنی فکر میں تمام علوم کو سمو دیا ہے۔ وہ ایک قومی شاعر، مفکر اور فلسفی ہیں۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی فکر و فلسفہ کو بیان کرنے کے لیے نثر اور شاعری کو اپنا مرکز و محور بنایا ہے۔ اقبال کی شاعری اظہار و تصورات کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف اور منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے عہد کو بلکہ مستقبل کو بھی اپنے افکار سے متاثر کیا ہے۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ عناصر نے انہیں ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے ایسا بلند مقام دیا ہے جو شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوا ہو۔ علامہ محمد اقبالؒ زندگی کا حقیقی مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جہاں حرکت وارتقاء اور مسلسل اخلاقی نہیں وہاں زندگی کا فقدان ہے، جنت اگر جزائے اعمال حسنہ ہو تو وہ اس کیفیت نفس کا نام ہونا چاہیے جہاں عرفان خودی، استحکام خودی اور عشق خلاق ترقی یافتہ صورتوں میں پایا جائے، دوزخ خودی کے سوخت ہو جانے کا نام ہے اس لیے دوزخ کی ماہیت کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ وہ ایک آگ[13] ہے۔ جس کے شعلے کسی خارجی ایندھن سے نہیں بلکہ قلب انسانی میں سے بلند ہوتے ہیں۔"[14]

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم "فکر اقبال" میں لکھتے ہیں:

"جسے ہستی کہتے ہیں اس کی ماہیت یہ ہے کہ وہ زندگی کا ایک قلزم بے پایاں ہے۔ شعور اور آگہی، زندگی ان کو بناتی بھی ہے اور توڑتی بھی ہے۔ جو چیز اس کے سامنے آتی ہے وہ اس کے فیض و شعور سے منور ہو جاتی ہے۔ اس کی کیفیت باہمہ اور بے ہمہ ہے۔ خلوت پرست اور صحبت ناپذیر ہونے کے باوجود جلوت میں ہر چیز اس سے مستفید ہے۔ وہ اپنے پیدا کردہ مظاہر کو آئین میں بھی اسیر کرتی رہی ہے، جس کی بدولت اس کے مظاہر قابل فہم اور قابل تسخیر ہو جاتے ہیں۔ شعور زندگی کو جہاں سے رقیب تر کر دیتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جہاں شناسی زندگی میں خود شناسی پیدا کرتی ہے۔ خود زندگی کی حقیقت سے نقاب اٹھاتی ہے لیکن نطق جو خرد ہی کا ایک پہلو ہے،

---

[13] قرآن کریم میں اس کی وضاحت یوں ملتی ہے۔ نَارُ اللهِ الْمُوقَدَةُ۔ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (الھمزۃ:۷،۶) یہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک چڑھ آئے گی۔

[14] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، **فکر اقبال**، (لاہور: سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ۷۹۔ ۸۰

ماہیت حیات کو عریاں کر دیتا ہے۔ جسے جہاں کہتے ہیں اس کی اپنی کوئی مستقل حقیقت نہیں۔ وہ زندگی کے سیر و سفر کے راستے میں ایک مقام ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ زندگی کے احوال میں سے ایک حالت کا نام ہے۔" (15)

منظور احمد "اقبال شناسی" میں لکھتے ہیں:

"انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اقدار کا حامل ہے۔ سورلے وحدت اور کثرت کے درمیان راستہ نکالتا ہے اور ایک ایسے فلسفہ کو پیش کرتا ہے جس کو اخلاقی الہیات کہہ سکتے ہیں۔ ایک متخرّس خدا جو کائنات کا اور اس کے علت و معلول کے سلسلوں کا خالق ہے وہی اقدار کا اصل منبع اور ان کا حامل ہے۔ ساری اقدار کا انشراح اور صدور اس کی ذات سے ہوتا ہے اور یہ خدا کا ہی کام ہے کہ وہ حقائق اور قدر میں رشتہ قائم کرتا ہے اور وہی انسان کو آزاد خودی یا ذات کی حیثیت عطا کرتا ہے۔"[16]

اقبال کے افکار میں جو تنوع پایا جاتا ہے وہ ان کے وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے تفکر اور مشرقی و مغربی فلاسفہ کی خوش چینی کا سبب بھی ہے، لیکن یہ امر اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور اسلامی نظریات واخلاقیات کو اپنی فکری اساس بناتے ہیں۔ ان کے فکری واخلاقی نظریات میں عالمگیریت کا پہلو نمایاں ہے جیسا کہ عزیز احمد لکھتے ہیں:

"اقبال نے اسلامی اخلاقیات سے زیادہ تر انہیں (اسلامی) اقدار کو چننے کی کوشش کی ہے، اگرچہ وہ اسلام کا نام بار بار لیتے ہیں لیکن دراصل یہ اخلاقی اقدار تمام بڑے مذہبوں اور ہر اخلاقی فلسفے میں مشترک ہیں۔"[17]

اقبال کے نزدیک انسانی اقدار کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ اخلاقی اقدار کو زندگی کے دوسرے شعبوں کی اقدار سے علیحدہ نہیں کرتے۔ وہ زندگی کو ایک وحدت مانتے ہیں جسے دنیا اور دین کے مختلف خانوں میں منقسم نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے بھی زیادہ محدود شعبوں میں زندگی کو تقسیم کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سرمایہ دارانہ ذہنیت کی دنیا سے انہیں سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ "اس میں اخلاقی اقدار اقتصادی مسائل سے الگ کی جاچکی ہیں۔" اقبال انسان میں ایک خاص اخلاقی شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اخلاقی شعور صرف انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی

---

[15] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، **فکر اقبال**، ۲۹۲

[16] منظور احمد، **اقبال شناسی**، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ)، ۴۱

[17] عزیز احمد، اقبال، **نئی تشکیل**، (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۶۸ء)، ۱۲۴

بھی ہے۔ اس اخلاقی شعور کو پیدا کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ اس کے لیے انسان کو اپنی تمام زندگی نئی بنیادوں پر استوار کرنی پڑے گی۔

وقار آدمیت کے حوالے سے فکر اقبال کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم "فکر اقبال" میں لکھتے ہیں:

"اقبال کی تعلیم میں وقار آدم اور عروج آدم کا نظریہ ایک مرکزی عقیدہ ہے۔ اقبال نے اس عقیدے پر افتخار و تاثرات کی ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کی ہے اور انسانی زندگی کے ممکنات اور تسخیر حیات کو اسلامی تعلیم کی اساس قرار دیا ہے۔ اسلام نے انسان کے اندر اعتماد نفس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے تئیں نائب الٰہی سمجھ کر فطرت پر حکمرانی کرے اور فطرت کے عناصر اس کی قوتوں سے مرعوب ہونے کی بجائے ان کو بلا استثناء قابل تسخیر سمجھے اس قوت تسخیر میں اضافہ اقبال کے ہاں استحکام خودی کی تلقین بن گیا ہے، اسلام میں توحید کا عقیدہ اور وقار انسانی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، نہ کوئی فطرت کی قوت انسان کی معبود ہو سکتی ہے اور نہ کوئی ایک انسان دوسرے انسانوں کا معبود بن سکتا ہے۔"[18]

اقبال کے ہاں تمام موضوعات کی رنگارنگی پائی جاتی ہے لیکن ان کا اخلاقی پہلو اتنا نمایاں ہے کہ اس کو تمام فکری مواد کا مرکز ماننا پڑتا ہے۔ اخلاقی فضائل کی متعدد اقسام ہیں، جن میں ایجابی اور سلبی اقدار شامل ہیں۔ ایجابی اقدار میں عزت نفس، خودداری، آزادی، حق گوئی، عزم و استقلال، جدوجہد، بہادری، غیرت و حمیت وغیرہ اور سلبی اقدار میں زہد، توکل، قناعت، تواضع، عاجزی، خاکساری، عفو، درگذر، حلم اور بردباری وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح ایجابی انفرادی اقدار اور ایجابی اجتماعی، سلبی انفرادی اور سلبی اجتماعی اقدار کی تقسیم بھی کی جاسکتی ہے۔ اقبال کے ہاں ایجابی و سلبی دونوں قسم کی اخلاقی اقدار پائی جاتی ہیں۔

انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے جب کہ باقی ساری کائنات کو انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ انسان کا کام ہے کہ اپنے اندر موجود صلاحیتوں کو استعمال کر کے تسخیر کائنات کا کردار ادا کرے۔ علامہ اقبال مسلمانوں سے فرماتے ہیں کہ آپ نے اندر موجود صلاحیتوں کو استعمال کرنا چھوڑ دیا ہے جبکہ خودی اس کو استعمال کرنے کا نام ہے۔

---

[18] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، **فکر اقبال**، ۸۱۔۸۲

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[19]

اسی بات کی وضاحت ہمیں قرآن کے میں اس انداز سے ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ[20]

"اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھلا بیٹھے پھر اللہ نے اُن کی جانوں کو ہی اُن سے بھلا دیا (کہ وہ اپنی جانوں کے لئے ہی کچھ بھلائی آگے بھیج دیتے)۔"

خدا کو بھول جانے کا نتیجہ نسیانِ ذات ہے۔ یہ نسیانِ ذات تقاضا ہائے حیوانیہ کا نسیان ہے نہیں؟ یہ تقاضا ہائے جسمانیہ کا نسیان ہے نہیں؟ تو نسیان سے یہاں مراد کیا ہے؟ فرمایا: تقاضاہائے روحانیہ، حقیقتِ باطنیہ اور اخلاقیہ کا نسیان ہے۔ مفہوم مخالف عرفان ذات ہوا۔ عرفان ذات، تشکیل ذات ہے، تشکیل ذات تعمیر اخلاق ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ نے جو خودی کا تصور دیا ہے وہ انسانی شخصیت اور کردار کی پہچان کے لیے کافی ہے۔ جب انسان اپنی خودی کو پہچان لیتا ہے تو وہ زندگی کے حقیقی نصب العین سے بھی واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ہر فعل اس کی خودی کے تابع رہتا ہے، کیونکہ خودی اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ اس کائنات رنگ و بو میں اپنا اظہار چاہتی ہے۔ اس کی اصل روح روحانی ہے، اقبال فرد کی ترقی کے لیے خودی کی ترقی اور تربیت پر زور دیتے ہیں کیونکہ اس کے تربیت انسان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔

علامہ اقبال خودی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین نفی نہیں بلکہ اثبات خودی ہے۔ یہ نصب العین صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان زیادہ سے زیادہ منفرد اور یکتا بن جائے۔ انسان کے اندر حیات کا مرکز خودی یا شخصیت ہے۔ شخصیت کشاکشی کی ایک کیفیت کا نام ہے اور اس کیفیت کی بقا سے ہی وہ قائم رہتی ہے۔ ہر وہ شے جو اس کیفیت کشاکش کی بقا میں معاون ہو ہمیں غیر فانی بنانے میں مدد گار بنتی ہے۔ خودی کے اس تصور سے اقدار کا معیار

---

[19] محمد اقبال، **کلیات اقبال**، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء)، ۲۴۳

[20] الحشر: ۱۹

قائم ہو جاتا ہے اور نیکی وبدی کا معمہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شے جو خودی کو مستحکم بنائے خیر ہے اور جو کمزور کرے شر ہے۔ آرٹ، مذہب، اخلاق سب کو خودی کے معیار ہی سے جانچنا چاہیے۔"[21]

اقبال کے نزدیک قوم کی زندگی کا انحصار وار تقاء کسی مصنوعی شیرازہ بندی پر نہیں بلکہ افراد کی ذہنی اور جسمانی نشوونما پر ہے۔ جب تک کسی قوم میں جواں دل اورآزاد مرد پیدا نہ ہوں جو اپنے دل کی گہرائیوں اور اپنے دماغ کی جولانیوں سے قوم کو نئے تصورات سے روشناس کرائیں اور تمدن کی بدلتی ہوئی ضروریات سے ہم آہنگ ہونے کا نیا اسلوب مہیا کریں اس وقت تک اس قو کے ارتقائی منازل طے کرنے کے امکانات نہیں۔[22]

خودی کی وجہ سے انسان میں استقلال، استقامت او ر مداومت عمل پیدا ہوتی ہے۔ اعتراضات اور مخالفتوں کے باوجود وہ اپنی سوچ وفکر کے پرچار میں مگن رہتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند[23]

اقبال کا فلسفہ خودی انسان کی معرفت فی النفس کا دوسرا نام ہے۔ اپنی معرفت حاصل کرنا اور اپنے آپ کو عزت دینا، ترقی دینا، اپنی عزت نفس کی حفاظت کرنا اور اپنے تخیل کو بلند کرنا ایک فرد کی تربیت ہے۔ قوم افراد کا مجموعہ ہوتی ہے اگر قوم کی اکائی کی اصلاح کر دی جائے تو پوری قوم کی اصلاح ممکن ہے۔ علامہ اقبال کا فلسفہ خودی انسان کی نفسیاتی تربیت کرتا ہے اور فرد کو اس دنیا میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ ہر دور کے انسان کو زندگی میں کامیابی وکامرانی کے لیے حوصلہ اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے، اقبال کا فلسفہ خودی انسان کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

اقبال مغرب کی مادی ترقی اور اخلاقی بے راہ روی کو جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سمجھتے اور ملت اسلامیہ کے مسائل کا حل دانش مشرق اور حکمت قرآنی میں تلاش کرتے۔ دورِ حاضر میں انسان نے فلسفہ ودانش سے زندگی میں بڑی آسانیاں پیدا کرلی ہیں۔ لیکن روح کے گوہر مقصود کو نہیں پاسکا۔ ان آسائشوں میں کھو کر انسان خود سے دور ہوتا چلا گیا اور عرفان ذات حاصل نہ کر سکا اور عشق کی قوت تسخیر سے محروم رہا۔

---

[21] محمد اقبال، **اقبال نامہ**، مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، (لاہور: نیشنل بک فانڈیشن)، ۳۷۰

[22] محمد اقبال، **تشکیل جدید الہیات اسلامیہ**، مترجم: نذیر احمد نیازی، (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۳ء)، ۲۳

[23] محمد اقبال، **کلیات اقبال**، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء)، ۳۴۵

عشق ناپید و خرد می گردش صوتِ مار
عقل کو تابع فرمان نظر کرنہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کرنہ سکا[24]

اسرار خودی کے دیباچے میں اقبال لکھتے ہیں:

"اخلاقی اعتبار سے افراد و قوم کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال یعنی خود کیا ہے کہ جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکما و علما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔"[25]

خودی کی جدوجہد کا انجام شخصیت کی تحدید سے چھٹکارا نہیں بلکہ تخلیقی عمل ہوتا ہے جو خودی کے وجود کو مستحکم کرتا ہے اور اس خیال سے اس کے ارادے کو تیز کرتا ہے تا کہ اس دنیا کو صرف عقائد اور عمل کے ذریعے بدلا اور بنایا جا سکے۔ گویا خودی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے کہ جس سے انسانی نفس کی تطہیر ہوتی ہے اور جب انسانی دل پاک و صاف ہو جائے تو پھر اس کا ہر عمل بھی پاک ہو جاتا ہے اور اسی پاکیزہ عمل سے بھی اخلاقی اقدار جنم لیتی ہیں۔

فکر اقبال میں انسانی اقدار کی روایت:

اگر علامہ محمد اقبال کی فکر کا مطالعہ کیا جائے تو آپ نے اپنی فکر میں انسانی اقدار اور اخلاقی روایات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ منظور احمد "اقبال شناسی" میں لکھتے ہیں۔

"انسانی فکر[26] خلا میں پیدا نہیں ہوتی اور نہ وہ آزاد ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے جس کے تاریخی سیاق و سباق نہ ہوں۔ انسانی فکر ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے اور کوئی فکر اپنی جگہ ایسی اٹل اور غیر متبدل نہیں ہوتی کہ اس میں

---

[24] علامہ محمد اقبال، **کلیات اقبال**، ضرب کلیم، ۶۹

[25] محمد اقبال، **کلیات اقبال**، ۵۴

[26] فکر بھی ایک مبہم لفظ ہے علم نفسیات اور منطق دونوں فکر سے بحث کرتے ہیں۔ جیسا کہ واضح ہے کہ نفسیات ایک طبعی علم ہے اور منطق ایک معیاری علم ہے۔ لہٰذا یہ دونوں علم فکر کی مختلف حالتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ نفسیات کا تعلق فکر کے عمل سے ہے اور نفسیات

ترمیم و تنسیخ یا تاریخی ارتقاء ممکن نہ ہو۔ تاریخ کی حرکت میں ایک قسم کی وحدت پائی جاتی ہے جو کثرت واقعات اور فکری تضادات کے علیٰ الرغم ایک قدر مشترک رکھتی ہے اور وہ خود فکری ارتقاء ہے۔"[27]

جہاں تک عمل کا تعلق ہے تو انسان کے اعمال کی بنیاد نظریہ پر ہوتی ہے۔ نظریہ دراصل عمل کے لیے نہ صرف بنیادی بلکہ ایک حرکت کا باعث بنتا ہے۔ جیسی سوچ اور فکر ہو گی ویسا ہی عمل تخلیق ہو گا، اور عمل ہی انسان کی نیک نامی یا بدنامی اور ترقی یا تنزلی کا سبب بنتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے[28]

زندگی کی تسخیر کے لیے انسان کی حرکت جب اپنے آپ کو منظم کرتی ہے تو عمل کہلاتی ہے۔ عمل کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر کائنات کی حرکت یا فطرت کا کوئی قانون انسان کے اصلی مقصد سے متصادم ہو تو فطرت کے سامنے سر خم نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ زندگی کے معرکے میں انسان کی شکست ہو گی۔ بلکہ عمل کی حرکت سے فطرت کے قانون کو تسخیر کر لینا چاہیے۔

اخلاقی اقدار:

اقبال کے ہاں اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کے مابین کوئی بعد نہیں پایا ہے بلکہ ان کی شاعرانہ حیثیت ان کی فلسفیانہ حیثیت پر غالب آکر ان کے کلام میں خوبصورتی، اثر آفرینی اور جذباتی وارفتگی پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال ایک اخلاقی فلسفی کے طور پر سامنے آتے ہیں اور بجا طور پر ایک معلم اخلاق کے اعلیٰ مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ اس معلم قوم نے خاص طور پر اخلاقی بنیادوں پر قوم کی رہنمائی کا جو فریضہ ادا کیا ہے وہ ایک طرف سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی انقلاب کا پیش خیمہ بنا تو دوسری طرف اس کے ذریعے ایک منتشر قوم کو ایک واضح سمت نصیب ہوئی جس پر گامزن ہو کر اس قوم نے اپنی منزل حاصل کی۔

ہمیں یہ بتاتی ہے کہ فکر کا عمل کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے برعکس منطق کا تعلق فکر کے نتائج سے ہے۔ سید کرامت حسین جعفری، منطق استخراجیہ، (لاہور: ایم۔ آر برادرز اردو بازار)، ۶۸

[27] منظور احمد، **اقبال شناسی**، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ)، ۳۵

[28] محمد اقبال، **کلیات اقبال**، ۴۶۰

اقبال انسان کی معاشرتی زندگی میں اخلاقی اقدار وروایت کا تذکرہ کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں:

''اقبال کا فلسفہ اخلاق، فلسفہ تمدن اور فلسفہ خودی سے مختلف نہیں ہے، وہ فرد اور معاشرے کے تعلقات، افراد کی ذمہ داریاں اور حقوق اور معاشرتی تحفظ و اتحاد سب کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ انفرادی زندگی اور اجتماعی حیات کے اسرار ورموز کو ایک دوسرے کے ساتھ منضبط رکھتے ہیں تاکہ ان کے فلسفہ حیات میں توازن برقرار رہے۔''[29]

اقبال نے انسان کو ایک خاص زندگی کا پیغام دیا ہے۔ ان سے بہتر اس چیز کو اور کون جان سکتا تھا کہ انسانی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی طور پر اخلاق کو جو جگہ حاصل ہے وہ ایک ایسی جگہ ہے کہ اس سے بہتر جگہ کسی اور چیز کے حصہ میں آہی نہیں سکتی۔ ہر قوم، ہر مذہب میں اہر زمانہ میں اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ روحانی، دماغی، مادی غرض کسی قسم کی ترقی بھی بغیر اعلیٰ اخلاق کے ممکن نہیں۔ ترقی کی عمارت جن بنیادوں پر استوار ہے ان میں ایک اخلاق ہے ترقی کے دوسرے عناصر اور اخلاق میں عمل اور رد عمل کا تعلق ہے۔ دوسرے عناصر اخلاق کو آگے بڑھاتے ہیں اور اخلاق دوسرے عناصر کو اور اس طرح انسانیت شاہراہِ ترقی پر گامزن رہتی ہے۔

منظور احمد ''اقبال شناسی'' میں لکھتے ہیں:

''عملی میدان میں ایک خاص قسم کے تصور نے غلبہ حاصل کر لیا تھا، جو لوگوں کو قسمت پر شاکر ہونا سکھاتا تھا افعالی اخلاق، جس میں ادب، پاس لحاظ، اطاعت، پست وبالا، شاہی اور فقیری کی اقدار بالا تھیں۔ مسلمان معاشروں کا اخلاقی معیار انفعالی تھا اور اخلاق کی وہ صفات جو آزاد معاشرہ اور انقلابی ذہن کا طرہ امتیاز ہیں، مثلاً شجاعت، بہادری، بے خوفی، مساوات، عدل وانصاف، اخلاقی اقدار کی صف میں ثانوی درجہ رکھتی تھیں۔''[30]

انسان کی زندگی میں اخلاقی اقدار کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ سے اس کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

عنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ[31]

---

[29] مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، **مکارم اخلاق اور اقبال**، مشمولہ: اقبال ۸۴ء، مرتبہ: ڈاکٹر وحید عشرت، (لاہور، پاکستان: اقبال اکادمی، ۱۹۶۸ء)، ۳۵۲۔۵۳

[30] منظور احمد، **اقبال شناسی**، ۴۳

[31] امام ابوداؤد، سنن ابوداؤد، **کتاب الادب**، باب فی حسن الخلق، حدیث: ۴۷۹۸

''حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بندہ مومن حسن اخلاق سے وہی درجہ حاصل کر لیتا ہے جو دن کے روزوں اور رات کی نمازوں سے حاصل ہوتا ہے۔''

انسانی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی طور پر اخلاق کی جو اہمیت ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ ہر قوم، ہر مذہب ہر زمانہ میں اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ روحانی، دماغی، مادی غرض کسی قسم کی ترقی بھی بغیر اعلیٰ اخلاق کے ممکن نہیں۔ ترقی کی عمارت جن بنیادوں پر استوار ہے ان میں ایک اخلاق ہے۔ ترقی کے دوسرے عناصر اور اخلاق میں عمل اور رد عمل کا تعلق ہے۔ اخلاق باقی عناسر کو آگے بڑھاتا ہے اور یہ عناصر اخلاق کو اور اس طرح ایک قوم شاہراہ پر گامزن رہتی ہے۔ اخلاق کی اہمیت کے پیش نظر ہر زمانہ میں اخلاق مسائل پر غور وخوض کیا گیا ہے۔ انسان جب سے دائرہ تہذیب میں داخل ہوا ہے اس وقت سے لے کر آج تک ہر قوم وملک نے اخلاقی قوانین وضع کیے ہیں۔

عظمت انسانی:

ڈاکٹر شاہد اقبال ''اقبال دوستی'' میں لکھتے ہیں:

عظمت انسانی پر اقبال کا اعتاد اس قدر پختہ ہے کہ وہ قدیم قصص میں بیان کردہ انسان کے کردار سے کہ جس کے مطابق انسان کو ماحول کے سامنے بے بس اور اسی لیے اس کو مجبور دکھی اور ناکافی صلاحیت والا بتایا جاتا تھا مطمئن نہیں ہوتے۔ اقبال کمزوری، لاچاری اور بے بسی کو کسی صورت بھی گوارا نہیں کرتے کیوں کہ یہ تمام تر کیفیات عظمت انسانی کے منافی ہیں۔[32] اقبال عظمت وبزرگی کا ایسا معیار رکھتے ہیں جو انسانوں کے لیے نمونہ بن سکے اور وہ معیار ہے جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات وحیات آپ ﷺ کامل ترین انسان ہیں، آپ ﷺ سے زیادہ عظمت ممکن نہیں، اس لئے آپ ﷺ کا اسوہ تا ابدی نوع انسان کے لیے ایک نمونے، مثال اور معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال خود بھی عشق رسول اللہ ﷺ سے سرشار تھے اور چاہتے تھے کہ انسان عظمت کے انتہائی معیار کو حاصل کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ کے نقش قدم پر چلیں اور آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ اپنائیں۔

رواداری کا تصور:

تحمل، رواداری اور برداشت ایسے افاظ ہیں جن کو ہم احترام، رحمت، سخاوت وفیاضی، بردباری نرم خوئی وغیرہ کی جگہ بھی رکھ سکتے ہیں۔ یہ انسانی اقدار اور اسلام کے اخلاقی نظام کی بنیادیں ہیں۔ یہ پختہ اور نظریاتی لوگوں

---

[32] ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، **اقبال دوستی**، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ۱۷۳۔۱۷۴

کے لیے روحانی تربیت و مشق اور ملکوتی فضیلت کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔ سید احمد رفیق فکر اقبال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"انفرادی فضیلتوں میں رواداری کا مقام کافی بلند ہے۔ یہ ایک ایسی قدر ہے جس کے بغیر نہ ہم اخلاقی طور پر بہتر ہو سکتے ہیں اور نہ ہماری شخصیت کو استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔ رواداری کا مطلب کسی کمزوری، لالچ یا خوف کی بنا پر اپنے خیالات اور عقائد کو پوشیدہ رکھنا اور دوسروں کے خیالات پر خاموش ہو جانا نہیں۔ بلکہ اپنے خیالات۔ عقائد اور نصب العین پر محکم یقین رکھتے ہوئے اور ان کے لیے کسی قسم کی بھی قربانی سے دریغ نہ کرتے ہوئے دوسروں کو ان کے خیالات اور افعال میں آزادی دینا اصل رواداری ہے۔ اصل رواداری کا سرچشمہ کمزوری نہیں بلکہ قوت ہے۔ طاقت ہے۔ اور اقبال اسی قسم کی رواداری کے قائل ہیں جس کی اساس قوت اور طاقت ہو۔ وہ رواداری جس کی بناء بے تعلقی، کمزوری یا لالچ وغیرہ ہو اقبال کی نگاہ میں مردود ہے۔ رواداری کی روح ذہن انسانی کے مختلف نقطہ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔"[33]

انسانی وحدت کا قیام:

اقبال نے ایک خاص طرز زندگی کا پیغام دیا ہے اور انفرادی واجتماعی طور پر اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ زندگی کی دیگر اقدار اور روایات سے باہم پیوستہ رہتی ہیں۔ اقبال زندگی کو ایک وحدت مانتے ہوئے اسے دین و دنیا کے مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک دین و دنیا میں دوائی کسی صورت بھی قابل تحسین نہیں ہے۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی[34]

وہ اپنی ایک اور نظم "دین و سیاست" میں اسی خیال کو یوں پیش کرتے ہیں:

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

---

[33] سعید احمد رفیق، **اقبال کا نظریہ اخلاق**، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ)، ۷۵، ۷۴

[34] محمد اقبال، **کلید کلیات اقبال**، مرتبہ: احمد رضا، (لاہور: ادارہ اہل قلم، ۲۰۰۵ء)، ۳۷۷

دوئی ملک و دیں کے لیے نا مرادی
دوئی چشم تہذیب کی نا بصیری[35]

اقبال کے اس پہلو کو اخلاقی نقطہ نظر سے پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں:

"اسلام کی نسبت علامہ اقبال کے افکار حکیمانہ ہیں۔ انگریزی خطبات میں بھی اور اشعار میں بھی جابجا یہ زاویہ نگاہ ملتا ہے کہ اسلام ماہیت حیات و کائنات کے عرفان اور اس کے مطابق زندگی کے رجحان اور میلان کا نام ہے۔ جس طرح طبیعات کے قوانین بلا امتیاز مذہب وملت سب پر مساوی عمل کرتے ہیں، اسی طرح اخلاقیات اور روحانیت کے آئین بھی عالم گیر ہیں۔ اسلام کسی ایک قبیلے، کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک کا مذہب نہیں، ریاضیات کی طرح اس کی صداقتیں بھی کائنات کے ہر شعبے پر حاوی ہیں۔"[36]

اقبال کا نظام اخلاق اسلامی ہونے کے ساتھ ساتھ عالم گیر بھی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک وہی اقدار وروایات اعلیٰ زندگی کی نمائندہ ہیں جو دنیا کے دیگر بڑے مذاہب میں بھی عزت و آبرو کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ وظیفہ فن کا بھی یہی تقاضا ہے کہ نظیرات کا جمالیاتی حسن اور عالمگیریت برقرار رکھی جائے کیونکہ تجربے کو احساس، فکر کو جذبہ اور شعور کو اسلوب بنا دینے کا نام ہی شاعری ہے۔

مرد حر:

اقبال کے افکار و نظریات میں خودی انسانی ذات کا مرکز اور روشن نقطہ ہے جس کا مقصد تعدین ذات کے علاوہ کچھ اور نہیں یعنی انسان اپنی کا راستعداد کو اس مقام پر لے جائے کہ خدا اس کی رضا طلب کرے اور وہ اپنی تقدیر بنانے کا خود اہل ٹھہرے دراصل خودی اقبال کے نزدیک پیام عمل ہے جو زندگی کے میدان میں اپنی منازل خود تلاش کرتی ہے اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کرتی ہے۔ اقبال کا مرد قلندر، مرد درویش، مرد مومن مرد آفاقی، مردِ حق آگاہ، انسان کامل، بندہ آزاد اور مرد حر، وہی ولی کامل ہے جس کا تعارف اسلامی تصوف کرواتا ہے۔ دونوں تزکیہ نفس اور استحکام خودی کی بدولت آفاق کی وسعت کو اپنے من میں سمیٹ لیتے ہیں۔

---

[35] ایضاً، ۴۴۶

[36] عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، **فکر اقبال**، (لاہور: بزم اقبال، طبع ششم، ۱۹۸۸ء)، ۱۴۲

ہمسایہ جبریل امیں بندہ خاکی

گھر اس کا نہ دہلی، نہ بخارا نہ بدخشاں[37]

ڈاکٹر عبدالشکور احسن اقبال کے مرد حر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مرد حر کی پہلی خصوصیت اس کا جذبہ ایمانی اور اس کی بے مثال جرأت و شجاعت ہے۔ لاتخف (خوف نہ کر) کے ایزدی پیغام نے اسے میدانِ عمل کا شہسوار بنادیا ہے۔ لاکھ حکیم سر بہ جیب ہوں تو وہ ایک کلیم سر بکف کے مقام کو نہیں پہنچتے۔ لاالہ کے تصور نے اس کے ضمیر کی شمعیں روشن کر دی ہیں اور وہ کسی سلطان وامیر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ راہِ طلب میں یوں زمین پر قدم رکھتا ہے کہ اس کے سوز سے راہوں کی نبضیں دھڑکنے لگتی ہیں۔ سنگ راہ اس کے سامنے شیشے کی طرح پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ حریر میں ملبوس ارباب اقتدار اس فقر عریاں کے خوف سی پیلے پڑ جاتے ہیں۔ موت اس کی روح کو پائندہ تر بنادیتی ہے۔"[38]

سر دیں ما را خبر ارو انظر

او درون خانہ ما بیرون در

ما کلیسا دوست ما مسجد فروش

او ز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش[39]

اقبال کا انسان کامل یا مرد حر اور نظریہ تصوف کا قطب ایک سی خصوصیات کے حامل ہیں۔ تصوف میں قطب کی موجودگی کائنات کا روحانی نظام چلانے کے لیے ضروری ہے اور اقبال کا مرد کامل کائنات کی تقدیر بدلنے اور نظام الٰہی کے قیام کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی قوت تسخیر نقوش باطل مٹادیتی ہے۔ اقبال ایک مرد کامل کے منتظر ہیں۔ قرآن پاک میں بھی انتظار کرنے کا حکم ہے:

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ[40]

---

[37] علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، بال جبریل، ۸۸

[38] علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ضرب کلیم، ۶۰

[39] اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ۲۸۸

[40] یونس: ۲۰

''تو کہہ دیجئے کہ تمام غیب کا اختیار اللہ کو ہے۔ تم انتظار کرو۔ میں بھی انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔''

خودی کی ماہیت کو جاننا عرفان نفس بھی ہے اور عرفان رب بھی اور اس عرفان میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زور خودی سے حیات عالم وابستہ ہے اور ہر انفرادی نفس کی استواری اس کی زندگی کی ضامن ہے۔ جو قطرہ شبنم بنتا ہے وہ چند لمحوں میں خودی کے ضعف کی وجہ سے نابود ہو جاتا ہے۔ جو قطرہ اشک بنتا ہے وہ ٹپک کر ناپید ہو جاتا ہے، لیکن جو قطرہ صدف نشین ہو کر اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا ہے وہ گوہر بن جاتا ہے۔ جس کی موج نور تلاطم قلزم میں بھی منتشر نہیں ہوتی۔ [41]

اقبال کے فلسفہ خودی کا مقصد انسان کو اپنی آزادانہ خودی، عزت نفس اور شخصیت سے آگاہ کر کے کارزار حیات میں بحیثیت خالق لانا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اسے اپنی پہچان ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اگر انسان اپنی خودی کا ادراک کر لے تو وہ نہ تو کسی کے سامنے جھک سکتا ہے اور نہ ہی غلام رہ سکتا ہے۔ خودی کے تصور کی بنا پر وہ بوسیدہ روایات اور عقائد کے بتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ پست ہمتی اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر فکر و عمل کو نئے ماحول او رضروریات کے مطابق ترتیب دینے کا گر جان لیتا ہے۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر وہ تہذیب و تمدن کے مصنوعی تفاخر، تخصیص اور عدم مساوات کو بدل کر خواجہ و مزدور، حاکم محکوم، محمود و ایاز، بندہ و نواز کی تمیز کو مٹاتا ہے۔ خالق و مخلوق میں ایک نیا رشتہ قائم کر کے دنیا میں ایک ایسی انسانی برادری قائم کرتا ہے جو قوائے فطرت پر فتح کر سکے اور اس کرابہ وہر کو جنت ارضی میں تبدیل کر سکے۔

فکر اقبال میں انسانی اقدار کی تطہیر کے وسائل:

اخلاق کا تعلق انسانی کردار، طور اطوار اور تہذیب زندگی سے ہوتا ہے، اس لیے انسان اپنے ہر اس فعل میں اس کا مختلف انداز میں اظہار کرتا ہے۔ پھر اسی کیفیت سے انسانی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے اور مہذب انسان کا تصور بھی اسی فکر کی روشنی میں سامنے آتا ہے۔ گویا ہر انسان مختلف مظاہر سے اپنے اخلاق کا اظہار کرتا ہے۔ ان مظاہر کو ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ شائستہ گفتگو:

[41] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، **فکر اقبال**، ۲۵۷

انسانی شخصیت کی پہچان اس کے طرز تکلم اور گفتگو سے ہوتی ہے۔ گفتگو میں لب ولہجہ، الفاظ کا انتخاب اور موقع محل کے اعتبار سے گفتگو کرنا انسانی شخصیت کا خاصا سمجا جاتا ہے۔ اسی بات کی وضاحت ہمیں فکر اقبال میں بھی ملتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل پاک باز[42]

شائستہ گفتگو انسانی اخلاقی اقدار کی بنیاد سمجھی جاتی ہے، کیونکہ کسی بھی شخص کی پہچان اس کی گفتگو سے ہوتی ہے اور انداز گفتگو سے ہی شخصیت کا تاثر قائم ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم میں لوگوں سے اچھی گفتگو کی تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا[43]

"لوگوں سے اچھی باتیں (نرمی اور خوش خُلقی کے ساتھ) کرنا۔"

اسی طرح اسوہ حسنہ میں بھی اس کی تعلیم ملتی ہے۔ نبی کریم ﷺ ہمیشہ نرم اور شیریں کلام کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی گفتگو مختصر مگر جامع ہوتی تھی، لب ولہجہ ایسا شیریں ہوتا کہ سننے والے محو ہو جاتے تھے۔ نرم اور شائستہ گفتگو کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے

لایدخل الجنة الجواظ ولا الجعظری۔قال والجواظ الغلیظ الفظ[44]

"نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ترش رو بد مزاج جنت میں داخل نہیں ہو گا اور نہ تکبر سے چلنے والا اور جواظ کا مفہوم ہے سخت مزاج اور بد خلق۔"

۲۔ شرم وحیاء:

آداب زندگی کا جزو بنانے کے لیے حیاء کی عادت معاشرتی پاکیزگی کی نشوو ارتقاء اور گھریلو زندگی میں بھی ماحول کی پاکیزگی کا باعث بنتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

---

[42] علامہ محمد اقبال، **کلیات اقبال**، بال جبریل، مسجد قرطبہ، ۱۹۵

[43] البقرہ: ۸۳

[44] امام ابو داؤد، سنن ابو داؤد، **کتاب الادب**، باب فی حسن الخلق، حدیث: ۴۸۰۱

إن الله عزوجل، إذا أراد يهلك عبدا نزع منه الحياء۔ فإذا نزع منه الحياء، لم تلقه إلا مقينا ممقتا۔ فإذا لم تلقه إلا مقيتا ممقتا، نزعت منه الأمانة۔ فإذا نزعت منه الأمانة، لم تلقه إلا خائنا مخونا، فإذا لم تلقه إلا خائنا مخونا نزعت منه الرحمة فإذا نزعت منه الرحمة، لم تلقه إلا رجيما ملعنا، فإذا لم تلقه إلا رجيما ملعنا، نزعت منه ربقة الإسلام۔[45]

"حیاء گویا وہ قوت اور ملکہ ہے جس سے انسان خیر وفلاح کی طرف مستعدی سے گامزن رہتا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے وہ تمام شرور وتعدی سے بچنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے۔ اس ایک صلاحیت کے عنقا ہونے سے نہ صرف دوسری فضائل حسنہ سے محرومی ہو جاتی ہے بلکہ انسانی رذائل کے قریب تر ہو جاتا ہے۔"

علامہ محمد اقبالؒ بھی اپنے دل میں ایک تڑپ رکھتے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ مسلم معاشرہ کیسے مغربی تہذیب کی چمک دمک سے متاثر ہو رہا ہے اسی لیے وہ فرماتے ہیں

غیرت ہے بڑی چیز جہاں تگ ودو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا[46]
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے[47]

جہاں تک شرم وحیاء کا تعلق ہے تو یہ وہ اخلاقی خصوصیت ہے جس کی بدولت کئی دوسرے محاسن کو بھی تحریک ملتی ہے۔ عفت وعصمت کی خوبی بھی اسی خلق حسن کی بدولت استحکام حاصل کرتی ہے اور بتہ سی برائیوں سے اسی وصف کی وجہ سے انسان اجتناب کرتا ہے اس وصف طبعی کی نگہداشت اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے دیناسلامی کی تربیت اقدار اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ شریعت کے قواعد وضوابط کے مطابق ستر عورت کو ہر حال میں ملحوظ خاطر رکھنا، غض بصر کے حکم الہی پر عمل کرنا، برہنگی اور عریانی سے مجتنب رہنا، حیاء کے جذبہ کو تقویت دیتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے حیا کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کے ارشادات گرامی ہیں:

---

[45] ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، **کتاب الزہد**، باب الحیاء، حدیث: ۴۱۸۳

[46] علامہ محمد اقبال، **کلیات اقبال**، ارمغان حجاز، ۲۸۸

[47] علامہ محمد اقبال، **کلیات اقبال**، بانگ درا، ۲۹۳

فقال رسول اللهﷺ فإن الحياء من الإيمان[48]

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حیا ایمان میں سے ہے۔"

والحياء شعبه من الإيمان[49]

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا شرم وحیاء ایمان کی ایک شاخ ہے۔"

حیاء ایمان کی ایک اہم شاخ ہے کیونکہ یہ نفس انسانی کی اصلاح و تربیت میں نہایت موثر کردار ادا کرتی ہے، نیز وہ انسان کو برائیوں سے روکتی ہے اور نیکیوں پر آمادہ کرتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حیاء ایسا وصف ہے جو انسان کے لیے بھلائی اور زینت کا باعث بنتا ہے اور ایمان کا اہم شعبہ ہونے کے ناطے سے جنت کی طرف پیش قدمی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

آپ ﷺ کے ارشاد مبارکہ ہیں:

الحياء من الإيمان ، والإيمان في الجنة، والبذاء، من الجفاء، والجفاء في النار۔[50]

"حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا حیاء ایمان کا ایک جزء ہے اور ایمان والے جنت میں جائیں گے اور بے حیائی کا تعلق ظلم سے ہے اور ظالم جہنم میں جائیں گے۔"

حیات عمرانی میں اجتماعی زندگی کا حسن اس امر سے وابستہ ہے کہ لوگ عادات حسنہ کے حامل ہوں۔ یہ پاکیزہ اطوار، ان کے باہمی تعلقات کو بھی پاکیزگی اور تقدس کے اس سانچے میں ڈھال دیں جہاں شیطانیت کا گزر نہ ہو سکے۔ حیاء ان کے خصائل حسنہ میں سے ہے جو تمام امور وعادات کو حسن اور خوبصورتی عطا کرتے ہیں۔

جفاکشی:

جفاکشی، سعی اور کوشش کو بھی اقبال ایک ضروری صفت قرار دیتے ہیں۔ کوشش اور سعی آپ اپنا انعام ہیں۔ خود اپنا آپ مقصد ہیں۔ سعی بے حاصل اور کوشش ناتمام کا اپنا مقام ہے۔ ان کی وقعت ان کے بے حاصل اور ناتمام ہونے سے کم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کا مقصد صرف خارجی کامیابی نہیں۔

---

[48] امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الادب، باب الحیاء، حدیث: ٦١١٨،، ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب الحیاء، حدیث: ۴۱۸۳

[49] ابن ماجہ، **سنن ابن ماجہ**، باب فی الایمان، حدیث: ۵۷

[50] امام ترمذی، سنن ترمذی، **کتاب البر والصلۃ**، باب ماجاء فی الحیاء، حدیث: ۲۰۰۹

تمنا آبرو کی جو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر ہے [51]

کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کا نتیجہ یقیناد کھ اور درد کو دعوت دینا ان سے نبرد آزما ہونا ان پر فتح پانا یا انہیں برداشت کرنے کی قوت پیدا کرنا ہے۔ اور اس بنا پر اقبال اخلاقی ترقی کے لیے ابتلا کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

ہے یاد مجھے نکتہ مسلمان خوش آہنگ　　دنیا نہیں مروان جفاکش کے لیے تنگ
چیتے کا جگر چاہیے شاہین کا تجسس　　جی سکتے ہیں بے روشنی دانش فرہنگ [52]

اقبال نے لاہور میں مسلم پولیٹیکل کانفرنس مارچ ۱۹۳۲ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''سخت بنو اور جفاکشی سے کام کرو۔ یہی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا راز ہے۔ زندگی کا شعلہ دوسروں سے مستعار نہیں لیا جاسکتا یہ تو اپنی روح کے نہاں خانے ہی میں روشن کیا جاتا ہے۔'' وہ کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑانے کے متمنی ہیں اور کبوتر کے تن ناز میں شاہین کا جگر پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ صرف جفاکشی، سخت کوشی اور تصادم کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ جفاکشی، بلند نظری اور عزم بلند پیدا کر کے انسان کی خودی کو مستحکم کرتی ہے۔ [53]

۳۔ سوز و گداز:

جب ہم انسانی زندگی میں اقدار کی بات کرتے ہیں تو اس میں اخلاقیات سب سے اہم معلوم ہوتی ہیں، جس کا ہم اپنی طرز زندگی میں اظہار بھی کرتے ہیں۔ مختلف معاشروں کے افراد کا طرز زندگی مختلف ہوتا ہے، اس لیے اخلاقی کیفیات بھی مختلف نظر آتی ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ مشرقی اور مغربی تہذیب کا عینی مشاہدہ کر رہے تھے اس لیے وہ مسلمانوں کی حالت دیکھ کر جو محسوس کرتے تھے اپنی فکری شاعری میں بیان کر دیتے تھے۔ انسانی شخصیت اور کردار سازی کے حوالے سے جو وہ احساس رکھتے تھے کہ انسانی شخصیت کیسی ہونی چاہیے اور اس میں اخلاقیات کا کتنا عمل دخل ہونا چاہیے اس کی طرف وہ بار بار توجہ دلاتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں:

حدیث بندہ مومن دلآویز

---

[51] علامہ محمد اقبال، **کلیات اقبال**، بانگ درا، ۱۵۷

[52] علامہ محمد اقبال، **کلیات اقبال**، بال جبریل، ۱۹۷

[53] **اقبال نامہ**، ۹۶

جگر پر خوں، نفس روشن نگہ تیز[54]

تر آنکھیں تو ہو جاتیں ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی ہو نہ سکا[55]

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی پیچ و تاب رازی کبھی سوز و ساز رومی[56]

علامہ محمد اقبالؒ انسان میں جن اقدار عالیہ اور اخلاق عظیمہ کی پیوند کاری چاہتے ہیں وہ شکستہ دلی، خستہ دلی، رقت قلبی، ٹوٹا ہوا آئینہ وہ اشکوں کی برسات چاہتے ہیں۔ وہ آنکھوں کے آب گینوں کو چھلک چھلک جانے والا چاہتے ہیں۔

اقبال کا خیال تھا کہ قوت، صفات الٰہیہ میں سے ہے اور بندے کا فرض ہے کہ وہ خود کو اس صفت سے متصف کرے۔[57] اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ میں روحانی قوت کا قائل ہوں جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے، اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔[58] گویا، اقبال کے نزدیک قوت کا سرچشمہ، حق پر انسان کا یقین ہے۔ اقبال کا بیان ہے کہ "یقین ایک عظیم قوت ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے ایک نظریے پر کسی شخص کو یقین آ گیا ہے تو اس نظریے کی صداقت پر میرا اعتقاد بے انتہا بڑھ جاتا ہے۔[59]

اقبال کے ہاں اس یقین کے کئی نام ہیں۔ جنون و عشق، درد و سوز، طلب و جستجو، ذوق و شوق، قلب و نظر، سب یقین کے مترادفات ہیں۔ یہی زندگی کو رواں دواں رکھتے ہیں، یہی انسان کو صفات الٰہیہ سے ہمکنار کر کے کلیم

---

[54] علامہ محمد اقبال، **کلیات اقبال فارسی**، ارمغان حجاز، ۲۳۰

[55] علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، بانگ درا، ۱۹۰

[56] علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، بال جبریل، ۲۷۸

[57] شذرات فکر اقبال، ۱۳۳

[58] نیرنگ خیال، اقبال نمبر ۱۹۴۲ء، ۱۰۰

[59] شذرات فکر اقبال، ۷۰

الٰہی کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔ انہی کی بدولت، انسان بارگاہِ ایزدی میں اوصاف خداوندی کے بیان کے ساتھ ساتھ اپنے اوصاف کے تذکرے کی اس طور پر جرأت کرتا ہے۔ اس لیے کہ ان میں نئی نسل کی سیرت و کردار سازی کے لیے قریب قریب وہی روش اختیار کی گئی ہے جس پر چل کر کوئی شخص اپنی خودی کو استوار و مستحکم بنا سکتا ہے۔ ایک مکڑی اور مکھی کے عنوان کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ خوشامد و تملق میں آنا گویا جان سے ہاتھ دھونا ہے۔ پہاڑ اور گلہڑی میں وہرچہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر، کے مصداق یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ حقیقی بڑائی کا تعلق قد و قامت سے نہیں بلکہ حرکت و عمل سے ہے۔ ایک گائے اور بکری، والی نظم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا وجود ساری مخلوق کے لیے باعث رحمت ہے۔

قرآن کریم میں بھی انسانی عظمت کا تصور ملتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا[60]

"اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے اور انہیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے اور انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔"

جہاں تک اخلاق کی اہمیت و فضیلت کا تعلق ہے تو نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ[61]

"ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میزان میں کوئی چیز بھی اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی نہ ہو گی۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق کو بہت اہمیت دی گئی ہے، کیونکہ اخلاق اور اخلاقی اقدار سے انسانی سیرت کی پہچان ہوتی ہے۔

علامہ محمد اقبال کی فکر میں بھی وہ اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آج کل کے نوجوان آدمیت کے باب میں گستاخ دبے ادب ہو رہے ہیں تو میرا دل کڑھتا ہے، سینے میں عجیب طرح کا پیچ و تاب

---

[60] بنی اسرائیل: ۷۰

[61] امام ابو داؤد، سنن ابو داؤد، **کتاب الادب**، باب فی حسن الخلق، حدیث: ۴۷۹۹

پیدا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے اخلاق حسنہ کی یاد آجاتی ہے اور ملت کا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے۔ اے کاش، نئی نسل، آدمی کے مقام محمود سے باخبر ہوتی اور احترام آدمیت کا حاصل جانتی۔

۴۔ نسلی امتیازات کا خاتمہ:

اقبال نے امت مسلمہ کو یہ درس دیا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ذات پات اور رنگ نسل، خون سے ماوراء اور پاک ہے اسی طرح امت مسلمہ کو بھی نسلی امتیازات سے پاک ہونا چاہیے کیونکہ وہ روئے زمین پر اللہ کی حجت ، نمائندہ اور پیغام رسول اللہ ﷺ کی داعی اور امین ہے۔ فرماتے ہیں:

قوم تو از رنگ و کوں بالا است
قیمت یک اسودش صد احمر است[62]

اے مسلمان تیری قوم رنگ و خون سے بہت اونچی ہے، مسلمان قوم کے ایک سیاہ شخص (حضرت بلالؓ) کی قدر و منزلت سینکڑوں گوروں اور سرخ رنگ والوں سے زیادہ ہے۔

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر[63]

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز[64]

رنگ و خوں کا امتیاز نسل انسانی کے لئے سوہانِ روح ہے۔ نسل پسندی، رنگ پسندی، قومیت برتری، ذات فوقیت، دولت برتری نے تاریخ آدم پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔ خون کی ہولی کھیلی گئی اور دریا بہائے گئے۔
اقبال کا یہ شعر قرآن حکیم کی اس آیت کی بھی تشریح کرتا ہے:

---

[62] علامہ محمد اقبال، **کلیات اقبال فارسی**، رموز بیخودی، ۲۴۶

[63] علامہ محمد اقبال، **کلیات اقبال**، بانگ درا، ۱۷۵

[64] علامہ محمد اقبال، **شکوہ**، ۳۰۲

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ[65]

"لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

نبی کریم ﷺ نے بھی خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا تھا:

یاایھاالناس ان ربکم واحد واباکم واحد الا لافضل لعربي علی عجمی ولا لعجمی علی عربي ولا اسود علی احمرولا احمر علی اسود الا بالتقوی۔[66]

"اے لوگو! تم سب کا خدا ایک ہے تم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہو سنو کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کسی سیاہ کو سرخ پر کسی سرخ کو سیاہ پر کوئی فوقیت نہیں (نسل ورنگت کے سب امتیازات ہیچ ہیں) فضیلت کا دارومدار صرف تقویٰ اور خوف خدا پر ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کا کوئی مقام، مرتبہ یا عہدہ اس کو کسی بھی لحاظ سے فضیلت نہیں دیتا، کیونکہ پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان حضرت آدم کی اولاد میں سے ہیں۔ لہٰذا تمام انسان باہم مساوی حقوق کے مالک ہیں، کسی شخص کو اچھی معاشرت کے لحاظ سے، اعلیٰ طبقہ ہونے کی وجہ سے کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ البتہ جب تک اس میں خوف خدا پیدا نہ ہو جائے جس کی وجہ سے وہ خدا کے بندے سے حسن معاشرت کرے اور ان کے باہمی حقوق کا خیال رکھے۔

کوئی فرد کمال کے درجے تک پہنچنا چاہے تو اسے، کمال کی ارتقائی منزلوں کو طے کرنے کے لیے ایک اچھے معاشرے، دوسرے لفظوں میں ایک باشعور وخوددار اور اعلیٰ اخلاقی قدروں پر مبنی ملت کی ضرورت ہوگی۔ یہ ملت اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ ہے ملت اسلامیہ میں رنگ ونسل اور زمان ومکان کی وہ سختیاں اور پابندیاں نہیں جو بنی نوع انسان کی ہلاکت کا وسیلہ رہی ہیں اور جن کے سبب عہد حاضر کی تمدنی زندگی تباہ ہو کر رہ گئی ہے، اس میں تمیز بندہ وآقا سماجی جرم ہے۔ اس میں کسی کو صرف اس بناء پر کوئی رعایت یا ترجیح نہیں دی جاسکتی کہ وہ نسل ومنصب کے لحاظ سے دوسرے سے بہتر ہے۔ ملت اسلامیہ کا نظام مساوات پر مبنی ایک مثالی نظام ہے، جس میں آزادی، عدل جوئی، انفرادی ترقی، اور بے خوف زندگی بسر کرنے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس میں فرد کی حیثیت جماعت میں گم نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت اور مستحکم ہو جاتی ہے۔

---

[65] الحجرات:۱۳

[66] امام بیہقی، **شعب الایمان**، حدیث: ۴۷۶۰

خلاصہ بحث:

انسانی زندگی میں اخلاق کی بہت اہمیت ہے اور اسلامی تعلیمات میں بھی اخلاق اور اخلاقی اقدار کو قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ افکارِ اقبال، نظریاتِ اقبال اور تصورات اقبال کو جمع کر لیا جائے تو حاصل مطالعہ طرز معاشرت کے حوالے سے اسلامی اخلاقی تصور جنم لیتا ہے۔ ان کے افکار میں تصور خودی، تصور انسان کامل، تصور شاہین اور تصور فقر وغیرہ سب اسلامی اخلاق کے مظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ کے ان فکری تصورات میں اسلامی تعلیمات کو بھی بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے اور عصری تقاضوں کی روشنی میں اقبال کی فکر میں ایک نئی روح بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس روح کو جسم میں حلول کر کے کائنات انسانی پر اللہ کے احکامات کی تنفیذ بھی ممکن بنائی جاسکتی ہے اور اپنا حسن و کردار بھی بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ کی فکر کا مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ سب سے پہلے فطری زندگی کے تصور کو سمجھا جائے، پھر تعمیر خودی کرنی چاہیے۔ خودی کا تعلق انسانی نفس کے ساتھ ہے اور نفس انسانی افعال کے اظہار کا بنیادی سبب بنتا ہے۔ جب خودی کو مکمل استحکام مل جاتا ہے تو پھر انسانی زندگی میں اخلاق کے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں اور ان مظاہر میں سے انسانی شخصیت و کردار سازی کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ اخلاقی اقدار کو قائم رکھنے کے لیے جن چیزوں کا ہونا ضروری ہے ان میں لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، خوش خلقی، رفق و رحمت، اعتدال پسندی، سادگی، پیکر محبت و الفت، مساوات و رواداری، شخصیت و کردار سازی، غیرت و حیاء، سوز و گداز اور خوف رجا شامل ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ کے تصور خودی و اخلاق پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنی شخصیت و اقدار کی تعمیر کر کے معاشرتی انحطاط کا خاتمہ کرتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی تعمیل بھی کر سکتا ہے۔ اعلیٰ اخلاق کا حامل انسان معاشرے میں انسانی اتحاد و مساوات جرات اور عظمت کی ترویج و ترقی کو جلا بخشتا ہے اس لیے وہ اللہ کا خاص بندہ بن کر حقیقی معنوں میں تکمیل کائنات میں معاونت بھی کرتا ہے۔ دور حاضر کے حالات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے چاہے معاشرتی زندگی ہو، معاشی ہو یا سیاسی زندگی ہو۔ آج ہم قانون کی پاسداری کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ایک مکمل ضابطے کا نام ہے اور اس کے مقابلے میں اخلاق جو کسی بھی ضابطے کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اس کو ہم نے صرف انفرادی زندگی تک محدود کر دیا ہے، بلکہ اجتماعی زندگی میں بھی اس کو فراموش کر دیا ہے، جس کی وجہ سے ہمارا معاشری اجتماعی اخلاقی اقدار سے محروم ہو گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ انسانی اقدار کا جو تصور دیا ہے اس کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے انسانی زندگی میں استحکام، معاشرتی مساوات اور اسلامی اخلاقی اقدار پر عمل پیرا ہو کر انسانی زندگی کو مستحکم اور خوش حال بھی بنایا جاسکتا ہے۔